باب۔۷

ترجمہ

فص اسماعیلیہ

حکمت علیہ

واضح ہو کہ وہ ذات کہ جس کا نام اللہ ہے اپنی ذات کے لحاظ سے بالکل ایک ہے۔ محض یگانہ ہے۔ بسیط محض ہے (یعنی جس کا بالفعل کوئی جز نہیں ہو سکتا)۔ ناقابل تبعیض و تقسیم ہے۔ اس میں کثرت ہے تو اسما کے لحاظ سے ہے، جو نسبتیں، مختلف جہتیں اور انتزاعیات ہیں۔

ہر موجود کے لیے اللہ تعالیٰ سے ایک نسبتِ خاص و تجلّی خاص ہے، جو اس کا ربِّ خاص کہلاتا ہے۔ ہر ایک موجود پر تمام اسما کی تجلی برابر طور پر نہیں ہو سکتی ورنہ باہم امتیاز و فرق نہ ہوتا، اور یہ محال ہے۔ ہاں انسانِ کامل، جو شانِ ربوبیت کا مظہر اُتم ہے، اُس پر تمام اسمائے الٰہیہ کی تجلی ہوتی ہے۔ ساحتِ احدیت الٰہیہ اور ذاتِ مقدسہ میں کسی ممکن کو قدم نہیں۔ کیوں کہ احدیتِ ذاتیہ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کچھ حصہ ایک کے لیے ہے اور دوسرا حصہ دوسرے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ احدیت، بسیط ہے۔ (یہ) تبعیض و تجزی (یعنی کسی بھی تقسیم) کو قبول نہیں کرتی۔ مگر یہی احدیتِ ذاتیہ منشائے انتزاع ہے تمام کثرت کا، اور منبع ہے تمام اسما کا، اور کل و مجموع بالقوہ ہے۔

سعید و خوش بخت وہ شخص ہے جو اپنے رب کے پاس پسندیدہ و مرضی ہو۔ عالم میں چیزیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے پاس مرضی و پسندیدہ ہے، اس وجہ سے کہ مربوب و عبد سے رب کی ربوبیت ہے۔ ربوبیت اضافت ہے۔ متضائفین (شامل ہونے والوں) اور طرفین (دو فریقوں) کو چاہتی ہے۔ بیٹا نہ تھا تو باپ نہ تھا۔ غلام نہیں تو آقا بھی نہیں۔ پس ہر مربوب ہر عبد اپنے رب کے پاس مرضی و مقبول ہے تو خوش بخت نیک نصیب ہے۔

بربادیِ عشق سے کب رہتی ہے معشوقی سب دم سے ہمارے ہے معشوقی وشیدائی

اسی لیے سہلؒ ابن عبد اللہ تستری نے کہا۔ ربوبیت کا ایک "راز" ہے اور وہ "تُو" ہی ہے {شیخؒ کہتے ہیں "تُو" سے مراد ہر مخاطب ہے} اگر وہ راز زائل و دور ہو جائے تو ربوبیت باطل ہو جائے۔ دیکھو سہلؒ نے فرمایا، لو ظهر (اگر ظاہر ہو) جو صرف امتناعی ہے یعنی امتناع جزا بسبب امتناع شرط کے آتا ہے۔ پس نہ وہ سرّ یعنی عینِ ثابتہ باطل ہو سکتا ہے (اور) نہ ربوبیت ہی باطل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ عینِ ثابتہ بغیر اس پر تجلّیِ خاص کے اور اس کے رب کے موجود فی الخارج ہی کیوں کر ہو سکتا ہے۔ عینِ ثابتہ تو علم الٰہی ہے جو دائماً موجود رہتا ہے تو ربوبیت بھی دائماً موجود رہے گی۔ یا یوں کہو کہ ہر عینِ خارجی، دنیا، برزخ اور آخرت میں کہیں نہ کہیں موجود رہے گا، تو ربوبیت بھی موجود رہے گی۔

ہر پسندیدہ و مرضی چیز محبوب ہوتی ہے، اور محبوب کا ہر کام ہر ادا محبوب ہوتی ہے۔ پس محبوب کا ہر فعل محبوب ہوتا ہے۔ بہر حال دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اچھا ہی ہو رہا ہے۔ کیوں کہ عین کا کوئی فعل نہیں۔ وہ تو صرف منفعل و متاثر ہوتا ہے۔ فعل تو اس کے رب کا ہے جو اس میں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ عین کو اِس کا تو اطمینان ہو گیا کہ فعل اس کی طرف تو منسوب نہ ہو گا۔ عین بھی رب کے ان تمام افعال سے راضی ہوا جو اس عین میں یا اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ افعال جو عین سے ظاہر ہو رہے ہیں اس کے رب کے پاس بھی مرضی و پسندیدہ ہیں۔ کیوں کہ ہر فاعل و صانع اپنے فعل و صفت سے راضی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اپنے فعل یا صفت میں اس کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے، اور اپنا پورا پورا کمال دکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ [(یعنی) جس نے ہر شئے کو (اس کی فطرت کے مطابق) صورت عطا کی، پھر اس کی طرف ہدایت اور رہنمائی کی، (طٰہٰ:۵۰)]۔ اس نے ہر ایک پر اس کی استعداد کے موافق تجلی فرمائی اور اس کو راستے پر لگا دیا۔ اب نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادت۔

اسماعیل علیہ السلام چوں کہ اس سرّ (یعنی راز) سے واقف تھے جس کو خدائے تعالیٰ نے بیان کیا کہ ہر ایک سے اس کا رب راضی ہے۔ ہر مظہر میں اس کے رب نے اپنا کمال دکھایا ہے، اس لیے وہ اپنے رب کے پاس مرضی و برگزیدہ ہوئے۔ اس علم کے بعد اطمینانِ قلب ہو جاتا ہے۔ فعلِ رب سے بظاہر بھی کوئی انکار پیدا نہیں ہوتا، جس سے وہ خود خدا کا مرضی و محبوب ہو جاتا ہے۔ گوہر موجود اپنے رب کے پاس مرضی ہوتا ہی ہے مگر بغیر علم و انکشاف کے اطمینان و سکون کہاں۔۔۔؟ یہ اطمینان و سکون کدھر۔۔۔؟

جب ہر موجود اپنے رب کے پاس مرضی و برگزیدہ ٹھیرا، تو اس سے لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے عبد کے رب کے پاس بھی برگزیدہ و مقبول ہو۔ یعنی (یہ) ضروری نہیں کہ "ہادی" کا عبد "مفصل" کے پاس بھی مرضی ہو۔ کیوں کہ اس نے اللہ اور رب الارباب سے تو لیا ہے جو کل اور مجموعۂ اسما ہے، مگر بتوسط اپنے رب کے، نہ کہ ہر ایک کے رب سے۔ اس کو کل و مجموع سے وہی ملا، وہی متعین ہوا جو اس کی استعداد کے مناسب تھا۔ اس کی فطرت کا اقتضا تھا اور وہی متعین نسبت، اس کا رب ہوئی۔

کوئی موجود نہ ذاتِ احدیت سے لے سکتا ہے، نہ اس کو اپنا رب بنا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس مرتبے میں اضافات و نسب کو دخل نہیں۔ عبد اور رب میں اضافت ہے۔ اسی لیے اہل اللہ نے تجلیِ احدیت کو ممتنع سمجھا (موجود ہونا محال جانا)۔ اس لیے کہ احدیت میں کثرت کہاں۔۔۔؟ تجلیِ رب و مربوب اور متجلی یعنی جلوہ گر اور متجلی لہٗ یعنی جلوہ گاہ کو چاہتی ہے اور دوئی کی مقتضی ہے۔

اگر تم نے اُس کو اُس سے دیکھا، جیسا کہ قرب فرائض میں ہوتا ہے، تو تم رہے کب۔۔۔؟ وہ تو اپنا دیکھنے والا آپ ہو۔ وہ تو ہمیشہ اپنا دیکھنے والا ہے ہی۔ اگر تم نے حق تعالیٰ کو اس کی تجلی سے اور اپنے نفس سے دیکھا جیسا کہ قرب نوافل میں ہوتا ہے تو احدیت کہاں رہی۔۔۔؟ "میں نے اُس کو دیکھا" کہنا کب صحیح ہوا۔۔۔؟ میں اور وہ ایک کب ہوئے؟ رائی و مرئی (دیکھنے والا اور دکھائی دینے والا) دو ہوئے۔ ناظر و منظور دوئی کے مقتضی ہیں۔ دوئی پائی گئی تو، یکی اور احدیت روانہ۔۔! جب حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو دیکھا اور حق تعالیٰ نے خود کو خود سے دیکھا تو ظاہر ہے کہ اس دیدار و رویت میں خود ہی ناظر ہوا اور خود ہی منظور۔

پس مرضی و مقبول کا مطلقاً مرضی و مقبول اور جمیع ارباب کے پاس پسندیدہ ہونا ضروری نہیں ہے مگر یہ کہ انسانِ کامل ہو۔ مظہر جامع ہو۔ اس میں تمام ارباب سے جو کچھ آئے اس کو لینے کی استعداد (و صلاحیت) ہو۔ اسماعیل علیہ السلام کے عین کو دوسرے اعیان پر اسی لیے فضیلت ہوئی کہ وہ تمام ارباب کے پاس مقبول تھے۔ چناں چہ خواب دیکھا حضرت ابراہیمؑ نے، اور ان کی اطاعت کی حضرت اسماعیلؑ نے۔۔۔ اور کٹوانے کے لیے اپنا گلا پیش کر دیا حضرت اسماعیلؑ نے۔۔۔ پھر اسماعیلؑ سے ربِّ اسماعیلؑ اور ربِّ ابراہیمؑ کیوں نہ راضی ہوں گے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کی۔ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا، (یعنی) وہ اپنے رب کے پاس مرضی و مقبول تھے، (مریم: ۵۵)۔

یہی حال ہر نفس مطمئنہ کا ہے کہ مقاصد الٰہی پورا کر کے راضی و مرضی بن کر، محب و محبوب ہو کر دوسروں سے افضل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے کہا جاتا ہے، ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ، (یعنی) {اپنے اگلے مقام، قدیم موطن} اپنے رب کی طرف رجوع کرے (الفجر: ۲۸)۔۔۔ اسے واپس آنے کے لیے کون حکم دے رہا ہے؟ وہی رب تو ہے جس نے اس کو پکارا تھا۔۔۔ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي۔ وَادْخُلِي جَنَّتِي، (یعنی) اے نفس مطمئنہ، تو اپنے رب کے پاس واپس آجا۔ تو رب سے راضی اور رب تجھ سے راضی۔، تو میرے بندگانِ خاص میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا، (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)۔ نفس مطمئنہ نے تمام ارباب میں سے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اسی سے راضی اور اس کا مرضی ہو گیا۔

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، (یعنی) میرے خاص بندوں میں داخل ہو، جن کا مقام عبودیتِ خاصہ ہے۔ یہاں عباد جو مذکور ہوئے ہیں ہر وہ عبد ہے جس نے اپنے رب کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے لیے مسخر کر لیا۔ خاص کر لیا۔ کسی اور کے رب کی طرف توجہ و التفات نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ تمام ارباب، نسب و اعتبارات ہیں۔ ان سب کی ذات ایک ہی ہے۔۔۔ ذاتِ حق جل و علا۔ مگر اپنے رب پر منحصر رہنے اور اپنی نسبت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

[وَادْخُلِي جَنَّتِي، (یعنی)] اور میری جنت میں داخل ہو۔

اعتبار: میرے پردے میں داخل ہو۔ میرا پردہ تُو ہی تو ہے۔ تُو ہی نے اپنی ذات سے مجھے چھپا رکھا ہے۔ میری معرفتِ متعینہ تو تجھ ہی سے ہوتی ہے۔ تُو خود کا شناسا تو میرا شناسا ہو گا، جس طرح کہ تُو موجود ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ میں موجود نہ ہوں۔ جس نے تجھے پہچانا اس نے مجھے پہچانا، مگر مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا تو تجھے بھی کوئی نہیں پہچان سکتا۔ پس جب تُو حجاب و پردۂ حق میں داخل ہو گیا تو اپنے نفس میں داخل ہو گیا۔ اب تُو نے اپنے نفس کو ایک دوسرے ہی طریقے سے جانا۔ یہ ایک جدا ہی معرفت ہے۔۔۔ اور وہ جدا معرفت تھی جس میں تُو نے اپنے نفس کو خدا کے پہچاننے کے وقت اپنے نفس کی معرفت سے معرفت حاصل کی تھی۔

اب تجھ کو دو معرفتیں حاصل ہوں گی۔ ایک معرفت نفس و رب کی باعتبار تیرے نفس کے۔ اور دوسری معرفت نفس و رب کی باعتبار رب کے اور اس کے مظہر ہونے کے۔۔۔ یہ معرفت باعتبار تیرے نفس کے نہ ہو گی۔

فانت عبد وانت رب لمن لهٗ فیه انت عبد

تو بندہ ہے اور رب سے جدا نہیں۔ کس کا بندہ۔۔۔؟ اس کا بندہ جس میں تو فنا ہو گیا ہے۔

وانت رب وانت عبد لمن لهٗ فی الخطاب عهد

تو رب سے وابستہ ہے اور بندہ ہے۔ کس کا بندہ ہے۔۔۔؟ اُس کا جس سے تو نے

أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ [(یعنی) کیا میں تمھارا رب نہیں؟ (الاعراف:۱۷۲)] کے جواب میں

بَلَىٰ [(یعنی) کیوں نہیں، ہاں (الاعراف:۱۷۲)] کہہ کر اقرارِ عبدیت کیا۔

فکل عقد علیه شخص یحلهٗ من سواه عقد

ہر عقیدے پر ایک شخص رہتا ہے۔ اس کو توڑ دیتا ہے۔ مخالفت کرتا ہے دوسرے کا عقیدہ۔

اللہ اپنے بندوں سے راضی ہے تو وہ مرضی و مقبول ہوئے۔ وہ بھی اس سے راضی ہیں، تو اللہ بھی ان کے پاس محبوب و مرضی ہوا۔ پس عبد و رب میں اضافت ہوئی اور وہ متخالفین (یا ڈرنے والوں میں سے) ہوئے۔ بلکہ اشتراک تراضیِ طرفین (دونوں کی رضامندی سے، میل جول) کی وجہ سے ان میں تقابل امثال ہوا (ایک دوسرے میں مماثلت تلاش کی گئی)۔ امثال پر غور کرو تو وہ بھی ایک طرح سے اضداد ہی ہیں۔ اس لیے کہ مثلین ایک جگہ جمع نہیں ہوتے (اور) مثلین آپس میں متمیز نہیں ہوتے، مگر محل کی وجہ سے۔۔۔ امثال میں ایک دوسرے سے متمیز ہیں تو مثلین مجتمع نہیں ہوتے، تو وہ ضدین ہوئے۔۔۔ اب ربوبیت و عبودیت پر غور کرو کہ یہاں مثلین کہاں ہیں؟ تو وجود میں بھی مثلین نہ ہوئے۔ جب مثلین نہ ہوئے تو ضدین بھی نہ ہوئے۔ وجود تو ایک ہی حقیقت ہے۔ اس میں کثرت کہاں۔۔۔؟ شئے تو اپنی ضد آپ نہیں ہوتی۔ پس مرتبۂ وجود میں عینِ ذات ہے۔ نہ رب ہے نہ عبد ہے۔

فلم یبق الا الحق لم یبق کائن فما ثمّه موصول وما ثمه بائن

وجود اور احدیت میں تو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی موجود رہا ہی نہیں۔ پس یہاں نہ کوئی ملا ہوا ہے نہ کوئی جدا ہی ہے۔ یہاں تو ایک ہی ذات ہے جو عین وجود ہے۔ یہاں یکی ہے۔ دوئی کو یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بذا جاء برهان العیان فما اری بعینی الا عینه اذا اعائن

دلیل کشف و عیاں اسی کو ثابت کرتی ہے لہٰذا میں جب اپنی دو آنکھوں سے گھور گھور کر

خوب غور سے دیکھتا ہوں تو اس کی ذات کے سوائے کچھ نہیں دیکھتا۔

یہ اثباتِ تقابل، اور عبد و رب کا باہم راضی و مرضی، محب و محبوب ہونا اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے (خائف ہے) کہ "یہ"۔۔۔ "وہ" ہو جائے اور غلبۂ شہود و وحدت سے تمیز اٹھ جائے اور احکام ربوبیت و عبودیت میں فرق آ جائے۔ یہ تمیز کہاں سے پیدا ہوئی۔۔؟ موجوداتِ خارجی پر غور کرو تو بعض جاہل ہیں، بعض عالم ہیں۔

جاہل، عالم کے خیال کی تصدیق نہیں کرتا لہٰذا بندوں میں تمیز واقع ہوئی۔ (پھر) ان کے ارباب میں بھی تمیز ہوئی۔ جدائی ہوئی۔ کیوں کہ معلول (یا مسبب) جدا ہوتے ہیں تو ان کی قلتیں بھی جدا ہوتی ہیں۔ اگر اسمائے الٰہیہ میں، جو ارباب ہیں، فرق نہ ہوتا تو ان اسما میں سے جو ایک کے معنٰی ہوتے تفسیر ہوتی۔ وہی دوسرے کے معنٰی و تفسیر ہوتی۔ ظاہر ہے کہ معز و مذل کے معنٰی ایک نہیں۔ مگر چوں کہ ان تمام اسما کی ذات ایک ہی ہے اس لیے معنٰی (اور) فہم میں مختلف ہوئے، اور باعتبار ذات کے ایک ہوئے۔ غرض یہ کہ اسما، دو چیزوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک ذاتِ مطلق پر جو سب میں موجود ہے۔ دوسرے خصوصیت حقیقتِ اسم پر۔ بہر حال مسمیٰ و ذات تو ایک ہے۔ پس معنٰی ہی مذل ہے باعتبار مسمیٰ و ذات کے، اور معنٰی مذل نہیں ہے باعتبار اپنے معنٰی حقیقت کے۔ اس لیے کہ ہر ایک سے، ایک جدا ہی معنٰی سمجھ میں آتے ہیں۔

فلاتنظر الی الحق وتعریه عن الخلق

حق تعالیٰ کی طرف نظر نہ کر، بحالیکہ تو جدا جانتا ہے حق تعالیٰ کو مخلوق سے

کیوں کہ حق تعالیٰ کے کمالات اس کے مظاہر سے ظاہر ہوئے ہیں۔

ولا تنظر الی الخلق وتکسوه سوی الحق

تو خلق کی طرف نظر نہ کر، بحالیکہ تو خلق کو حق تعالیٰ سے لباسِ غیریت پہناتا ہے

کیوں کہ مخلوق وبندہ بغیر حق تعالیٰ کے موجود ہی نہیں ہو سکتا۔

ونزّهه وشبّهه وقم فی مقعد الصدق

حق تعالیٰ کی تنزیہ و تشبیہ دونوں کا قائل رہ اور مقام صدق میں قائم رہ۔

وکن فی الجمع ان شئت وان شئت نفی الفرق

چاہے تو تُو مقام جمع و وحدت میں رہ، چاہے تو تُو تمام فرق و واحدیت و کثرت میں رہ

بشرطیہ کہ دونوں میں مخالفت نہ سمجھے

تحر بالکل ان کل تبدیٰ فصب السّبق

اگر تنزیہ و تشبیہ دونوں کا قائل رہے گا تو تمام کمالات و مقامات کا محیط ہو گا

اور گھوڑ دوڑ میں جھنڈی حاصل کرلے گا، اگر کوئی کمال یا مقام ظاہر ہو گا۔

فلا تفنی ولا تبقیٰ ولا تفنی ولا تبقیٰ

نہ تُو نیست ہو گا نہ ہست ہو گا، نہ کسی کو نیست جانے گا نہ ہست جانے گا۔

ولا یلقی علیک الوحی فی غیرہ ولا تلقی

وہ تجھ پر القا کرے گا اور تجھ سے باتیں کرے گا تو اپنا غیر سمجھ کر نہ کرے گا

اور نہ تُو اس سے دعا کرے گا تو غیر سمجھ کر کرے گا۔

تعریف، صدقِ وعدہ پر ہوتی ہے۔ یعنی جس بات کا وعدہ کرے اس کو پورا کرے۔ صدقِ وعید تعریف نہیں ہوتی۔ یعنی سزا سنا کر بخش دینا جائز ہے، بلکہ مستحسن ہے۔ حضرتِ الوہیت کا بذاتہٖ اقتضا تعریف اور بالارادہ کاموں پر تعریف ہے۔ پس ذاتِ الٰہی کی تعریف صدق وعد پر ہو گی نہ صدق وعید پر، بلکہ تجاوز و عفو پر (ہو گی) ۔۔۔ (لیکن) اگر مجرم کی فطرت اور نظام عالم کی حکمت کا تقاضا ہو۔

اللہ کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ رسولوں سے وعدہ کر کے خلاف ورزی کرے گا۔ بلکہ بعض قصور واروں کے متعلق فرمایا۔ وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ [(یعنی) ہم ان کی غلطیوں کو در گزر کرتے ہیں ﴿الاحقاف:۱۶﴾]۔ اللہ بندوں کے گناہوں سے در گزر فرمائے گا، باجود یہ کہ گناہوں پر وعید (یعنی سزا دینے کا) فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف فرماتا ہے، کہ وہ صادق الوعد تھے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کی طرف سے تو وعید نہیں۔ کیوں کہ اس کو سب سے ایک ہی نسبت ہے، اور وہاں کوئی مرجع نہیں۔ بلکہ مطلق وعید یا دائمی وعید آتی بھی ہے تو عین کی استعداد اور اس کی فطرت کے اقتضا سے آتی ہے، نہ کہ بذاتہٖ ذاتِ حق سے۔

فلم یبقی الا صادق الوعد وحدہ وما لوعید الحق عین تعائن

اللہ تو صرف صادق الوعد ہے۔ کوئی آنکھ وعیدِ حق کو دیکھتی ہی کب ہے؟

کیوں کہ ہر شخص کو اس کا حصہ دینا اس کی استعداد کے مطابق عطا کرنا عین عنایت ہے۔

وان دخلوا دار الشقا فانّهم علی لذّة فیها نعیم مبائن

اگر مجرمین و گنہگار، بد بختی کی جگہ {یعنی دوزخ میں بھی} جائیں تو وہ ایک لذتِ خاص میں ہیں اور نعمتِ جداگانہ سے بہرہ یاب ہیں۔ جُعل {یعنی غلاظت} کے کیڑے کو غلاظت کی بدبو باعثِ حیات ہے اور گلاب کی خوشبو اس کے لیے باعثِ موت ہے۔

نعیم جنان الخلد فالامر واحد وبینهما عند النحلی تبائن

دوزخ کی نعمت، جنت (و) خلد کی نعمت سے جدا ہے۔ کیوں کہ منشاسب کا ذاتِ واحدہ ہے جمال ہے تو اس کا ہے، جلال ہے تو اس کا ہے۔ مگر ظہور کے وقت مبائنت (یعنی ضد) معلوم ہوتی ہے۔

یسمیٰ عذابا من عذوبۃ طعمہ وذاک لہ کالقشر والقشر صائن

دوزخیوں کے عذاب کا مزا ان کی فطرت کے لحاظ سے دیکھو تو شیریں ہے، جو بظاہر عذاب معلوم ہوتا ہے وہی بباطن بہ اقتضائے فطرت باستعداد و عین مناسب ہے۔ یہ صورت ہے جو اپنی حقیقت کی صیانت و حفاظت (یعنی بحالی و تحفظ) کرتی ہے، اور بظاہر عذاب، عذاب معلوم ہوتا ہے۔

Siddiqui Publications